وہ اپنے چھپر کی طرف جاتا تھا جب اس نے بستی میں سے ماتی اور اُس کے پُتروں کی گڈ نکلتے دیکھی ۔۔۔ اس کے پہیوں میں سے دگڑ دگڑ کی آوازیں نہیں آرہی تھیں بلکہ وہ ایک سست اور ٹھہری ہوئی چال سے ڈولتی جاتی تھی ۔۔۔ ماتی بیلوں کے بیچ بیٹھی انہیں ہانکتی تھی اور اس کے پیچھے اس کے تینوں پتر وانگو چندرو اور جھوریا بیٹھے تھے اور ان کے ساتھ گاگری کی بہن کواسی تھی جس کا بچہ بھوک سے مرا ۔۔۔ گڈ کے ساتھ ان کی پوٹلیاں لٹکتی تھیں اور پیچھے پیچھے دو لاغر بیل جیسے گھسٹتے آتے تھے ۔۔۔ ان سب کے سیاہ مہاندروں میں زردی ٹھنڈی ہو رہی تھی اور ان کے پیٹ اتنے پچکے ہوئے تھے اور ٹانگوں پر ماس اتنا تھوڑا تھا کہ وہ سوکھی لکڑیاں لگتی تھیں اور وہ جیسے ایک نیند میں تھے ، اُونگھتے ہوئے ۔ اور ان کے جنور بھی ان جیسے تھے ۔۔۔ گڈ کو مشکل سے کھینچنے والے بھوک سے گرتے اور بڑی بڑی ہڈیوں والے ۔۔۔

پکلی نے آواچڑھایا تو اس کی بُو بستی تک گئی اور وہ سب جو دیواروں کے ساتھ ٹیک لگائے پڑے تھے حیران ہوئے کہ یہ اب کیا بنائے گی اور کس کے لئے پکائے گی ۔۔۔ برتن بھانڈا تو کنک باجرے کے لئے ہوتا ہے ۔۔۔ گھڑا پانی کے لئے آتا ہے اور گھگھو گھوڑے بچوں کے لئے تو ان سب کی اب کسے مانگ ہے ۔۔۔

ڈورگا پچھلے کئی دنوں سے اپنی پکی چار دیواری میں پڑا تھا ۔ اس نے ہار تو نہیں مانی تھی کیونکہ وہ ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا پر آس پاس رکھوں میں ، بستی میں کہیں بھی کھانے کو کچھ نہ تھا ، سبز گھاس کا ایک تنکا نہ تھا ۔۔۔ نرا مچھلی کا ماس تھا ۔۔ اور دریا کا پانی کم ہونے سے پہلے تو مچھلی بہت تھی اور پکڑنے میں آسان تھی پر اب وہ بھی تھوڑی رہ گئی تھی ۔۔۔ اور مچھلی کا ماس نرا کوئی کب تک کھائے ۔ اب تو اسے دیکھ کر ہی ڈورگا کو ابکائیاں آنے لگتی تھیں اور وہ اسے آنکھیں بند کر کے منہ میں رکھ کر نگلنے کی کوشش کرتا تو وہ باہر کو آتا ۔۔۔ اس کا جسّہ تو بس کنک کے سواد کو ترستا تھا ۔۔۔ صرف ایک بُرکی روٹی کی ۔۔۔

وہ ہمت نہیں ہارا تھا ، بس وہ اسے دیکھتا تھا جو اسے موہنجو سے لایا تھا کہ وہ کیا کرتا ہے کب جاتا ہے اور کدھر کو نکلتا ہے ۔ اس سویر جب وہ سندھو میں تیرتی کشتی میں تھا اور ورچن کو دیکھتا تھا اور پھر اس کے پیچھے پیچھے آتا تھا تو اب بھی وہ اسے دیکھتا تھا اور اس نے اسی کے پیچھے پیچھے جانا تھا ۔ اسے خود تو پتہ نہیں تھا کہ اس نے کدھر جانا ہے ۔۔۔ یہاں سے کہاں جانا ہے ۔۔ پر ایک ڈر اس کے کلیجے کو کھاتا تھا ، وہ اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی چار دیواری کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا ۔۔۔ اور پھر اسے یہاں ایک اور کام بھی کرنا تھا ۔۔۔ اس نے میل کو جانا تھا ۔۔۔ وہ اسے سنتا تھا ، کان لگا کر سنتا تھا کہ وہ وہاں ہے اور ڈکراتا ہے ۔۔۔ پکلی نے اور ورچن نے بھی کہا کہ وہاں کچھ نہیں ہے اور تمہیں کوئی نہیں بلاتا پر وہ جانتا تھا کہ وہ وہاں ہے اور اسے بلاتا ہے اور اس نے آخر کو میل کو جانا ہے ۔

اس نے پہلے رکھوں میں جا کر میل کرنا تھا پھر کہیں جانا تھا ۔

آوے کی بُو گھاس پھونس اور سروٹ کے جلنے سے اٹھتی ہے اور ڈور گا نے تتھنے سکیڑے کہ پکلی اب کیا پکاتی ہے ۔ وہ اٹھا اور ذرا ہمت کر کے اٹھا کہ بھوک اسے بھی دھیما کرتی تھی اور باہر آیا۔ باہر دھوپ تھی اور وہ اس میں کھڑا ہوا تو یوں لگا جیسے وہ اُپلا ہو اور ابھی پھونک سے دھکنے لگے گا ، گرمی اتنی تھی کہ جلاتی تھی ۔

پکلی آوے کے پاس کھڑی تھی ۔

"یہ میرا برتن پکانے کو آوا چڑھایا ہے ؟" ڈور گا بولا

"نہیں ۔۔۔" پکلی کی بے دانت مسکراہٹ عجیب تھی "میں گھڑے پکاتی ہوں گھاگھرا کے لئے ۔۔۔"

"گھاگھرا کے لئے ؟" وہ اچنبھے میں آیا ۔

"ہاں ۔۔۔" پکلی پھر بولی "پانی تو گھڑوں میں ہوتا ہے ۔ ان گھڑوں میں جو پکلی پکاتی ہے اور ان پر کالے رنگ سے پتے بوٹے الیکتی ہے تو ان میں پانی ہوتا ہے ۔۔۔ اگر گھڑے نہیں ہوں گے تو پانی تو کم ہو گا ۔۔۔ وہ آئے تو جائے کہاں ۔۔۔" وہ اپنے ڈھلکے ہوئے کولہوں پر ہاتھ رکھے آوے میں سے نکلنے والے دھویں کو دیکھتی تھی اور اس کے دونوں بچے جواب اتنے بچے نہیں تھے کچھ دور کھڑے ڈرتے تھے اور اس کا گھر والا بہت دنوں سے وہاں نہیں تھا ۔ وہ دریا کے ساتھ ساتھ کہیں چلا گیا تھا کہ وہ بھوک سے بے حال ہوا تھا اور کہہ گیا تھا کہ میں ادھر جا کر دیکھوں گا کہ کہیں پانی ہے کنک ہے تو پھر آ کر تمہیں بھی لے جاؤں گا ۔۔۔ پر وہ بہت دنوں سے گیا ہوا

تھا ۔۔۔ اور اس کے جانے سے پکلی کی ہمت گھٹ گئی تھی اور وہ بس بیٹھی رہتی تھی اور اس کے بچے اس کے چہرے پر بیٹھنے والی مکھیاں اڑاتے رہتے تھے ۔ ایک روز وہ سویرے چھپر سے باہر نکل کر بیٹھی تو پھر وہیں بیٹھی رہی ۔ بچے رکھوں کی طرف گئے تھے کہ کچھ کھانے کو ملے اور وہ وہیں سارا دن دھوپ میں بیٹھی رہی اور بس اس دن کے بعد اسے کچھ ہوا تھا اور اب وہ گھڑے پکا رہی تھی ۔

"گھڑے ، گھاگھرا کے لئے ؟" ڈور گا نے پھر کہا پر جیسے خود سے کہتا ہو ۔

پکلی اسے دیکھ کر ہنسی ۔ اس کے مسوڑھے کالے ہو چکے تھے ۔۔۔ "ہاں تم تو اپنی پکی اینٹوں میں بند رہتے ہو اور وہ کنک بھالنے گیا ہے اور لوٹا نہیں ۔۔ اور مجھے پتا ہے کہ اگر گھاگھرا کے کنارے ایک کے اوپر ایک گھڑا رکھا جائے ۔۔۔ اور ایسے ساتھ ساتھ کہ دور سے وہ ایسے لگیں جیسے بہت ساری عورتیں جُڑ کے بیٹھی ہیں گھاگھرا کے کنارے ۔۔۔ تو پانی آئیں گے ۔۔۔ جب وہ دیکھیں گے کہ گھڑے خالی ہیں اور ان کا انتظار کرتے ہیں تو وہ آئیں گے انہیں بھرنے کے لئے ۔۔۔ کل آوا تیار ہو گا پک کر ۔۔۔ تو میرا ساتھ دے گا ۔ ان کو ادھر لے جانے میں ؟" ۔۔۔ پکلی کا مہاندرہ بدلا ایسے کہ وہ ایک چھوٹی سی بچی لگنے لگی جو گھگھو گھوڑے بنا کر خوش ہوتی ہے اور ڈور گا کو کہنا پڑا کہ ہاں میں تیرے ساتھ گھڑے اٹھا کر ادھر لے جاؤں گا پر تو اب چھپر کے اندر چل ۔۔۔ اور وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر چھپر کے اندر چھوڑ آیا اور اس کے دونوں بچے بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئے اور اصل میں وہ دونوں اب قد کاٹھ میں اتنے ہی تھے جتنی کہ پکلی تھی ۔۔۔ ایک تو بالکل پکلی ایسا تھا ۔ جوں جوں آوے کے اندر آگ تیز ہوتی جا رہی تھی توں توں اس کی بُو کم ہوتی جاتی تھی ۔۔۔ تیسرے روز جب آوا پک کر ٹھنڈا ہوا تو اس نے پکلی کے ساتھ وہ گھڑے گھاگھرا کے کنارے تک رکھ آنے کے لئے اٹھائے ۔۔۔ وہ جانتا تھا کہ دھوپ میں پڑی رہنے کی وجہ سے اور پیٹ سکڑنے کی بنا پر بستی کے دوسرے لوگوں کی طرح پکلی بھی اب وہ نہ تھی جو پہلے تھی اور اسی لئے اس نے وہ گھڑے چپ چاپ اٹھائے اور گھاگھرا کے کنارے ایک کے اوپر ایک کر کے رکھ دیئے پال بنا کر اور وہ دور تک چلے گئے اور دور سے وہ ایسے ہی دکھائی پڑتے جیسے بہت سی عورتیں جُڑی بیٹھی ہیں ۔۔۔ جب آخری گھڑا رکھ کر وہ واپس آیا تو پکلی پھر دھوپ میں بیٹھی ہوئی تھی پر اُس کے مہاندرے پر ایک ایسا ٹھہراؤ تھا جو پہلے اَن دیکھا تھا ۔۔۔ وہ پورے سکھ میں تھی اور مسکرا رہی تھی اور اس کے بچے اس کا ایک ایک ہاتھ تھامے اس کی ہتھیلیوں پر جھکے تھے ۔۔۔

ڈورگا کا سانس ٹکتا نہیں تھا ۔ گھڑے خالی تھے پر آوے سے گھاگھرا تک کم سے کم کوس کا راستہ تھا اور وہ منہ اندھیرے سے انہیں ڈھو رہا تھا ۔۔۔ اس کا زور گھٹ گیا تھا ۔۔۔ وہ چلتا تو ٹانگیں بوجھ اچھی طرح نہ سہارتیں اور کم زوری کی وجہ سے آنکھوں کے سامنے چرمرے سے ناچتے ۔۔۔

وہ اس کے قریب ہوا اور کہنے لگا "تو اندر چل ۔ یہاں دھوپ ہے"

پکلی کے مسوڑھے دھوپ میں آئے اور وہ خوش مسکراتی تھی "نہیں میں یہیں رہوں گی ۔۔۔ تو مجھے یہیں پڑا رہنے دے ۔۔۔"

"نہیں اٹھ ۔۔۔" ڈورگا آگے ہوا تو اس کے مہاندرے کا ٹھہراؤ ڈوبنے لگا "نہیں نہیں ۔۔۔" اس نے اپنے سوکھا ہوا ہاتھ آگے کر دیا "نہیں مجھے یہیں رہنے دے ۔۔۔ دھوپ میں ۔۔۔ یہاں سے گھاگھرا دکھائی پڑتا ہے ۔۔۔"

پکلی کے آوے سے گھاگھرا کا وہ حصہ دکھائی دیتا تھا جو ٹاپوؤں کے گرد بل کھا کر جیسے ریت میں گم ہوتا تھا ۔ ڈورگا کے اندر اس کا ڈر آیا کہ پکلی آج ایسی کیوں ہے اور اسے کچھ شک بھی ہوا کہ وہ ایسی کیوں ہے پر وہ چاہتا نہیں تھا کہ ایسا ہو کیونکہ یہ وہ عورت تھی جس نے اسے اس کا پہلا گھر دیا تھا ، جس کے پاس وہ واپس آتا تھا ۔ ڈورگا نے بھی دانت نکال دیئے جو دھوپ میں لشکے "چل اب تو خوش ہو ۔۔۔ سارے گھڑے جو تو نے پکائے تھے گھاگھرا کے کنارے ایک کے اوپر ایک کر کے رکھے ہیں ۔۔۔ اب تو اس میں پانی آئے گا ، کیوں آئے گا ناں ۔۔۔ تو کتنا پانی آئے گا"۔

"گھاگھرا میں اب کبھی پانی نہیں آئے گا ۔۔۔" پکلی نے ڈورگا کو دیکھا ۔ ایک ایسا بندہ جو موہنجو سے صرف اس لئے آیا کہ اس کی تھکی ہوئی ہڈیوں کو آرام دے ۔ اس کا ہاتھ بٹائے ۔

ڈورگا کی مسکراہٹ بند ہوئی اور وہ اس کے اور قریب ہوا "نہیں ۔۔۔ آئے گا ۔۔۔ تو نے اتنی محنت سے جو گھڑے بنائے ہیں اور ان پر پھول بوٹے لیکے ہیں اور آوا چڑھا کر انہیں پکایا ہے اور اب وہ گھاگھرا کے کنارے خالی پڑے ہیں تو وہ بھریں گے ۔۔۔"

"نہیں بھریں گے ۔۔۔" پکلی بولی "میں نے گھڑے اس لئے تو نہیں بنائے کہ ان میں پانی بھرے گا ۔۔۔ کہاں سے بھرے گا ۔۔۔ وہ تو گم ہوا اور ساتھ میں اس بستی کو بھی لے گیا ۔۔۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بڑے سبھاؤ سے بات کرتی تھی ۔۔۔ "تو اپنی چار دیواری میں بند تھا اور تو نے دیکھا نہیں کہ میں نے اس بار جو دن رات ایک کر کے ان گھڑوں پر بیل بوٹے لیکے

ہیں ، مور کے پر اور مچھلی کے چانے بنائے ہیں اور پیپل کے پتے اور پھول سجائے ہیں ۔۔۔ تو نے دیکھے نہیں ؟"

"نہیں ۔۔۔" ڈورگا دکھی ہو کر کہنے لگا "میں نے نہیں دیکھے ۔۔۔"

"پاورشنی پوچھتی تھی کہ پکلی یہ بیل بوٹے تم کیسے ایک لیتی ہو ۔ وہ رکھوں میں سے میرے لئے پتلی شاخیں لایا کرتی تھی اور پوچھتی تھی اور میں کہتی تھی کہ یہ بیل بوٹے میرے سر میں تو نہیں ، یہ تو ان ٹہنیوں اور شاخوں میں ہوتے ہیں جنہیں رنگ میں ڈبو کر جھجھروں ، ڈولوں ۔ صحنکوں اور گھڑوں پر پھیرتی ہوں ۔ اور یہ آپ ہی آپ بنتے چلے جاتے ہیں اور یہ تو اسی نے بتایا تھا کہ میں گھڑوں پر مچھلی کے چانے بناتی ہوں نہیں تو مجھے تو پتہ نہیں تھا کہ میں یہ کیا بناتی ہوں ۔ یہ سب تو بنتا چلا آرہا تھا اور میں بھی اس کو بناتی چلی جاتی تھی اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ جھجھر میں پانی ہوتا ہے اس لئے اس پر پانی میں رہنے والے جنور کا بوٹا بناتے ہیں ۔۔۔ تو ڈورگا میں نے یہ بوٹے بنائے دن رات ایک کر کے ۔۔۔ ایک کر کے" وہ رکی اور چپ ہو گئی اور ڈورگا بھی وہیں بیٹھا رہا جہاں تھا سانس روکے وہ سنتا رہا اور پھر اس کا سانس ٹھیک ہوا تو وہ بولنے لگی "ایسے بوٹے بنائے جو میں ساری حیاتی اس بستی کے لئے بناتی رہی اور پھر ایسے بھی بنائے جو ابھی تک نہیں بنا سکی تھی اور وہ صرف ٹہنیوں میں چھپے تھے اور میں نے انہیں نکالا اور کہا کہ اس کے بعد تم باہر نہیں آؤ گے ، میرا ہاتھ نہیں ہو گا تو کیسے آؤ گے اور وہ آئے ۔۔۔ ایسے ایسے نرالے بوٹے ڈورگا ۔۔۔ کہ میں دیکھتی تھی تو حیران ہوتی تھی کہ یہ کہاں تھے اور آج تک کیوں نہیں بنے ۔۔۔ شائد انہیں بھی پتہ چل گیا تھا کہ اب سب کچھ سوکھنا ہے ۔۔۔ ابھی باہر آنا ہے اس ٹہنی میں سے جس میں ہم چھپے ہیں اور وہ ہاتھ جو ہمیں الیکتا ہے بعد میں نہیں ہو گا ۔۔۔"

"دھوپ تپتی ہے ۔۔۔" ڈورگا کا جسّہ پسینے میں بھیگتا تھا اور اس کی آنکھوں میں پسینہ گرتا تھا "چھپر میں چلتے ہیں ۔۔۔ آؤ" اس نے ہاتھ آگے کیا ۔

"نہیں ۔۔۔" پکلی نے غصے سے کہا "اور سنو ۔۔۔ میں نے یہ سارے جتن کئے ۔ بیل بوٹے ایسے ایسے بنائے جو ۔۔۔ اور تم نے دیکھا نہیں کہ آج تم جتنے گھڑے لے کر دریا پر گئے ان سب پر الگ الگ بیل بوٹے تھے کوئی ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا تھا"

"اچھا ۔۔۔" ڈورگا نے منہ کھول کر کہا "پر کیوں ؟"

"اب ان گھڑوں کی پال ادھر کنارے پر ہے ۔۔۔ اور ابھی کناروں کے اندر تھوڑا بہت پانی ہے اور پھر یہ بھی سوکھے گا ۔۔۔ اور پھر صرف کنارے رہ جائیں گے ۔۔۔ ریت بھی آئے

گی ۔۔۔ ہوا بھی ۔۔۔ اور میرے گھڑے گریں گے ٹوٹ کر ۔۔۔ اور اسی ریت میں دبتے جائیں گے ۔۔۔ پھر اور ریت آئے گی ۔۔۔ کبھی شائد مینہ بھی آئے اور کبھی ۔۔۔ پتہ نہیں کب ۔۔۔ آج سے کئی رُتوں بعد ۔۔۔ میرے گھڑوں کی ٹھیکریاں گھاگھرا کے خشک راستے میں سے نکلیں گی اور لوگ دیکھیں گے ۔۔۔ اور وہ ان کے بیل بوٹے دیکھیں گے اور کہیں گے کہ کیا سوہنے اور عجب بیل بوٹے ہیں جو کسی نے بنائے ۔۔۔ اور وہ کس کا ہاتھ تھا جس نے انہیں بنایا ۔۔۔ اور کب بنایا ۔۔۔ جب کہتے ہیں کہ ادھر بستیاں تھیں اور دریا تھا اور رکھوں میں مور بولتا تھا ۔۔۔ تو ڈور گا وہ میرے ہاتھ کو یاد کریں گے ۔۔۔" پکلی نے اپنے بچے سے ہاتھ چھڑا کر اسے ہوا میں اونچا کیا ۔۔۔ نچڑا ہوا سیاہ اور سوکھا ماس جس میں رگیں بھی خشک تھیں ۔۔۔

ڈور گا نے اپنی آنکھیں جھپکیں اور ان میں تھوڑا پانی تھا ۔۔۔ "چل اندر چل"۔

پکلی نے صرف سر ہلایا اور اسے وہاں سے چلے جانے کو کہا ۔ وہ اٹھا اور بوجھل پاؤں اٹھاتا اپنی چار دیواری میں آ لیٹا ۔۔۔ شام کو وہ باہر آیا تو پکلی وہیں تھی اسی حالت میں ٹیک لگائے ۔۔۔ اور اس کا سانس چلتا تھا ۔۔۔ اور اس سے اگلی سویر اس نے دیکھا کہ سانس نہیں ہے تو اس نے اسے اس برتن میں ڈالا جو وہ پہلے سے بنا چکی تھی اور اسے اٹھا کر ادھر لے گیا جدھر ایسوں کو لے جاتے تھے جن کے سانس ختم ہوتے تھے ۔۔۔

رکے ہوئے پانی کے کیچڑ میں لوگ جھکے ہوئے تھے ۔ انہیں لگتا کہ گدلے پانی میں کوئی سایہ سا تیرا ہے تو وہ اس پر تیزی سے جھپٹتے ۔۔۔ سارا دن وہ یہی کرتے رہتے اور کبھی کبھار ان کے ہاتھ کوئی چھوٹی سی مچھلی آجاتی ۔۔۔

پاروشنی ان سے دور جب ان کو دیکھتی تو پل دو پل کے لئے اس کا منہ کھل جاتا کہ یہ لوگ دریا کے درمیان میں کیسے کھڑے ہیں پانی میں ڈوبتے کیوں نہیں اور پھر اس کے اندر ڈر زور زور سے دھڑکتا کہ یہ تو سچ مچ دریا کے بیچ کھڑے ہیں اور پانی ان کے گھٹنوں تک آتا ہے ۔۔۔ اور ایک دن یہ اور نیچے ہوگا ۔۔۔ اور ایک دن بے انت کچھ اس میں تیزی سے ادھر ادھر چلتے کہ اپنے آپ کو کہیں چھپالیں پر پانی کی کمی کی بنا پر وہ اور زیادہ دکھائی دینے لگتے ۔۔۔ کسی نے ایک بڑا مچھ بھی دیکھا تھا جو اپنی پُوشل پٹختا تھا اور پانی میں چلتا اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کرتا تھا ۔

ان کے کھانے کو کچھ نہ تھا اور وہ گدلے پانی سے پیٹ بھرتے تھے ۔

ورچن ویہڑے کے کونے میں ٹیک لگائے بیٹھا رہتا اور اسے دیکھتا کہ وہ کیا کہتی ہے پر وہ چپ تھی اور وہ ایسے ختم نہیں ہونا چاہتا تھا یوں کچھ کئے بغیر ہاتھ پر ہاتھ دھرے ۔۔۔ پر وہ چپ تھی ۔ وہ بولے تو کچھ ہو ۔۔۔ اور وہ اس سے کہہ نہیں سکتا تھا کہ اب کیا کرنا ہے ۔۔۔ پاروشنی کے جُتے میں بھی کالی زردی پھیلتی تھی اور اس کی آواز آگے پیچھے ہوتی تھی اور کم آتی تھی پر وہ ہر سویر گھاگھرا کے کنارے ضرور جاتی ۔۔۔ اسی نے ایک سویر ورچن کو بتایا تھا کہ ادھر کنارے کے ساتھ کھڑے ایک دوسرے پر رکھے ہیں اور ان پر ایسے بیل بوٹے ہیں جو اس سے پہلے نہ اس نے دیکھے اور نہ پکلی نے بنائے اور وہ اتنے سوہنے تھے کہ اسے اپنی بھوک بھولی اور گھاگھرا کی خشکی بھولی اور وہ وہیں کھڑی انہیں دوپہر تک دیکھتی رہی ۔

سمرو اپنے چھپر میں رہتا پر ہر شام آتا اور تھوڑی دیر ان دونوں سے پرے ہٹ کر بیٹھتا اور چلا جاتا ۔۔۔ ان سے اب بات نہیں ہوتی تھی ، بات کے لئے زور چاہئیے اور وہ کم ہو رہا تھا ہر

دن ۔۔۔

دھروا اپنے بیلوں کی راکھی بیٹھتا تھا پر ایسے کہ اسے اب یہ معلوم نہیں تھا کہ اندر باڑے میں وہ سانس لے رہے ہیں یا ان کی آنکھیں پتھرا چکی ہیں ۔۔۔ اگر سانس لیتے ہیں تو کتنے ہیں ۔۔۔ وہ انہیں کھانے کے لئے کچھ نہیں دے رہا تھا ۔ جوان کے لئے چارہ لاتے تھے ان کے لئے چلنا پھرنا بوجھ ہو چکا تھا اور دھروا اپنے تھڑے پر بیٹھا رہتا اور اس کی ٹھوڑی سے لٹکتے بال کابلی سے ہوا میں سرسراتے رہتے ۔۔۔ گجرو اور چمرو اور اپلے تھاپنے والی کومی اس کے سامنے سے گزرے اور دور ہو گئے ۔۔۔ ماتی کے بعد انہوں نے بستی کو چھوڑا ۔۔۔ اور ان کے بعد ہر روز کوئی نہ کوئی اٹھتا اور چلا جاتا ۔۔۔ کچھ ریت میں دو تین دن سفر کے بعد لوٹ آتے کہ وہاں بھی کچھ نہیں ۔۔۔

ایک شام مندرا جوان سب میں سے زیادہ بوڑھا تھا ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور ورچن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کچھ پوچھنا چاہا تو وہ لڑھک گیا ۔ جانے کب سے وہ جا چکا تھا ۔ ورچن اسے اٹھا کر رکھوں میں لے گیا کہ اسے وہاں رکھ آئے جہاں اس کے مائی باپ کے پنجر تھے جن کے ساتھ دکھی ہونے پر وہ لپٹتا تھا اور روتا تھا اور اس نے وہاں پہنچ کر دیکھا کہ رکھ اب وہ نہیں ہیں ۔۔۔ وہ بھی ان کی طرح بھوکے اور پیاسے ہیں اور سکڑ چکے ہیں ۔۔۔ پتے یا بوٹیاں کہیں نہ تھے ، سوکھے ہوئے رکھ تھے ٹیڑھے میڑھے اور ان کے گرد ریت جمع ہو رہی تھی اور اس کے مائی باپ کے پنجر پتہ نہیں کونسے رکھ کے تنے میں تھے ۔۔۔ اس نے مندرا کو ایک گرے ہوئے کھوکھلے تنے کے اندر رکھا اور بستی کو لوٹ آیا ۔

"می آؤں ۔۔۔ می آؤں" شائد مور بولا ۔۔۔ وہ ابھی تھا ۔

پوہ ماگھ کا پالا کم ہونے لگا ۔۔۔ اور پالا بھی کیسا تھا دھوپ میں ایسی خشک تیزی تھی کہ وہ ہر جتے اور بوٹے کو چوستی تھی اور سکھا کر پھوک بنا دیتی تھی ۔۔۔ بستی اور گھاگھرا پر دھول ابھی تک ٹھہری ہوئی تھی اور کم نہ ہوئی تھی ۔ ہوا اپنے ساتھ ریت لاتی جو گلی میں بچھ کر چوکھٹوں تک اونچی ہونے لگی ۔۔۔ پھر چیتر میں رُت بدلی تو ہریالی اور کھلے موسموں کی بجائے تپش نے ہر شے کو چاٹنا شروع کر دیا ۔۔۔ کنوؤں میں سے پانی اتنے مٹی بھرے نکلتے کہ انہیں پینے کی بجائے نگلنا پڑتا ۔ گھاگھرا کا سارا پاٹ چھوٹے چھوٹے جوہڑوں میں بدل چکا تھا اور وہ بھی سوکھتے جاتے تھے ۔ ان میں بہت کم کوئی مچھلی پھڑکتی ۔۔۔ چھپروں کی کچی دیواریں ڈھے رہی تھیں اور ان

کے ساتھ ٹیک لگا کر اونگھنے والے بھی ان کے ساتھ ڈھے رہے تھے ۔۔ بستی میں بہت کم لوگ رہ گئے تھے ، کچھ تو وہیں ٹیک لگائے پار پہنچ گئے اور کچھ نکلے اور ریت میں کھو گئے ۔ ان میں کئی ایسے تھے جو کہتے تھے کہ ہم کہیں نہیں جائیں گے بس اس بستی کے آس پاس ریت کی دنیا میں سفر کریں گے ، جہاں پانی ملے گا پڑاؤ کریں گے اور جو ملے گا کھالیں گے پر اپنا آسمان نہیں چھوڑیں گے چاہے آنے والے دنوں میں ہمارے بیچ سے پھوٹنے والوں کو یہ یاد رہے نہ رہے کہ ہم بھی کبھی بستے تھے ۔

اب وہاں صرف پاروشنی ، ورچن ، سمرو اور ڈور گا بچے تھے ۔۔۔ اور دھروا جو ان بیلوں کی راکھی کر رہا تھا جو باڑے کے اندر تھے ، مُردہ یا زندہ اس بارے میں وہ نہیں جانتا تھا پر وہ راکھی کرتا تھا ۔ ڈور گا کبھی کبھار بستی کی طرف آتا ، وہ اب پہلے سے بھی زیادہ جھک گیا تھا ، وہ پاروشنی کے ویہڑے میں جھانکتا اور واپس چلا جاتا ۔۔۔

پاروشنی اب ایسے لگتی تھی کہ بس پنجر ہے اور اُس پر کس کر ماس چڑھا ہوا ہے ۔ اُس کی ہڑیں نکل آئی تھیں اور آنکھیں باہر کو آتی تھیں ۔۔۔ اُس کے وہ کولہے سوکھ گئے تھے جن پر وہ بیٹھتی تھی تو وہ پھن کی طرح پھیلتے تھے اور چلتی تھی تو اپنے آپ اُس کے بیچ گری اور نمی آجاتی تھی ، اور اُس کی بھری ہوئی چھاتیاں خالی تھیں اور پچک گئی تھیں ۔۔۔ پاروشنی ایک پنجر تھی جو بس ٹیک لگائے سانس لیتا تھا اور اُس کے قریب ورچن تھا جو اُس پنجر کو دیکھتا تھا ، سوچتا تھا کہ مجھے یہاں سے جانا چاہیئے پھر اُس کی طرف دیکھتا تھا کہ اس کی اُبلتی آنکھیں کیا کہتی ہیں اور وہ کچھ نہیں کہتی تھیں اس لئے وہ سوچتا ایک دن اور دیکھ لوں ۔۔۔ ایک دن اور ۔۔۔ اور سمرو بھی آتا تھا ، گرتا پڑتا ، وہ پہلے ہی کچھ زیادہ زور والا نہیں تھا اور اب تو کئی دنوں سے پتہ نہیں کتنے دنوں سے صرف مٹی بھرا پانی پیٹ میں جاتا تھا ۔۔۔ تو وہ آتا تھا اور پاروشنی کے ویہڑے میں جھانک کر چلا جاتا تھا کیونکہ وہ بھی اُس کی آنکھیں دیکھنے آتا تھا کہ کیا کہتی ہیں اور اُسے بھی وہی جواب ملتا تھا ، جو ورچن دیکھتا تھا ، وہ کچھ نہیں کہتی تھیں ۔

پاروشنی کے ویہڑے میں اب ریت بہت تھی ۔۔۔ وہ جھاڑو دینے کی سکت میں نہیں تھی ۔۔۔ پانی بھی وہ دونوں مل کر نکالتے اور اُس کیچڑ کو گلے میں اُتار کر پھر دیوار کے ساتھ لگ جاتے ۔۔۔

ڈور گا کئی دن نہ آیا تو پاروشنی کے اندر ڈر اُترا کہ اُسے کیا ہوا ۔۔۔

وہ اپنی چارپائی میں پڑا تھا اور سویر ہونے کو تھی کہ اُس کے کانوں میں ایک دھمک آئی

جیسے دُور ڈھول پر تھاپ پڑتی ہو اور ڈکرانے کی آواز آئی اور اُس کے پیچھے پیچھے ایک گرم ہواڑیہ کہنے آئی کہ تم کہتے تھے کہ میں میل کو آؤں گا ۔۔۔

ڈور گا اُس مٹّی پر چلتا تھا جس پر اب ریت تھی اور جو کبھی ڈوبو مٹّی کہلاتی تھی اور یہاں اتنی ریت تھی کہ گمان بھی نہیں ہوتا تھا کہ کبھی یہاں ڈوبو مٹّی ہوا کرتی تھی ۔۔۔ ڈور گا جاتا تو صرف ایک کو ملنے کو تھا پر وہ اکیلا نہ جاتا تھا ۔۔۔ نہ جاتا تھا ۔ یہاں وہ سب تھے جو آج تک بھٹے کی چاردیواری کے اندر پیدا ہوئے اور مر گئے ۔ وہ پیدا ہوئے تو بندے کی اولاد تھے پر دھیرے دھیرے جنوروں کے جائے بنتے گئے ۔ اینٹیں بناتے اور ڈھوتے ڈھوتے اُن کی کمر جُھک گئی ، کھال سکڑ گئی اور اُن کے جُتّے سے جنوروں ایسے بال لٹکنے لگے ۔۔۔ اور جب بھی کبھی اُن ہزاروں لاکھوں جنوروں میں سے کوئی ایک اپنے بھوکے پیٹ اور باہر لٹکتی زبان کے ساتھ اپنے جھکے ہوئے جُتّے پر مالک کی مار کھاتا تو کہتا تھا کہ میں آخر کو تم سے ملنے آؤں گا ۔۔۔

ڈوبو مٹّی جو کبھی تھی اُس کے خاتمے پر اُس نے رکھوں کے اندر قدم رکھا ، وہاں تاریکی نہ تھی ، لشکتی دھوپ تھی اور رکھوں کے سُوکھے پنجر اور ریت کی زبانیں تھیں اور الاؤ کی گرمی تھی ۔۔۔

ڈور گا بے دھڑک چلتا تھا اور دیکھتا تھا کیونکہ دھوپ تھی اور وہ دیکھ سکتا تھا ۔۔۔ پر اُس کی ٹانگیں بھڑتی تھیں ، بھوک سے زور کم پڑتا تھا ۔

"می آؤں ۔ می آؤں" مور ایسے بولا جیسے آخری بار بولتا ہو ۔

ڈور گا نے دیکھا کہ وہ اپنا جھاڑو پھیلائے کھڑا تو ہے پر اُس کی پتلی ٹانگیں اُس کو سہارتی نہیں اور وہ گرتا ہے اور پھر سنبھلتا ہے اور اُس کے رنگ دھوپ میں سوکھ چکے ہیں اور آنکھیں خشک ہو چکی ہیں ۔ ڈور گا نے اپنی چپٹی ناک کے تتھنوں کو پھلا کر خشک ٹہنیوں کی باس کو اپنے اندر کھینچا کہ وہ کہاں ہے ۔۔۔ "میں تجھے سونگھتا ہوں" وہ مسکرایا اور باس کو اپنے اندر تک پھیلایا اور اندھا دھند بھاگنے لگا ۔۔۔ چیتر کی تپتی دھوپ تھی اور پتہ چلتا تھا کہ آگے کیا ہے ۔

پتہ نہیں وہ ایک خشک ٹہنی تھی یا مامن ماسا کا سُوکھا ہوا جُثہ جس نے اُس کے قدموں تلے کڑکڑاتی ٹہنیوں کو سُنا اور دیکھا کہ نیچے کوئی گرے ہوئے خشک تنوں سے ٹکراتا اُن کو پھلانگتا بھاگتا ہے ۔ اور وہ وہاں ایک سوکھے ہوئے ڈال کے ساتھ کھڑا اُڈیک میں تھا ۔ اُس کی کالی بھور آنکھیں اپنے زور میں بے سُدھ تھیں ۔۔۔ اُس کے تتھنوں کی گرم ہواڑ ڈور گا کے سیاہ جُتّے پر بھاپ کی طرح پھیلتی تھی ۔۔۔ اور وہ دونوں رُکھوں میں میل کرتے تھے ۔ ایک میں اُن سب

کا زور تھا جو جُھکے ہوئے تھے اور دوسرے میں اُن جھکے ہوؤں میں سے چوسا ہوا زور تھا ۔۔۔ تو زور ایک ہی تھا ۔

"مامن ماسا ۔۔۔ مامن" چیوا ایک سُوکھے ہوئے رُکھ کے نیچے دہائی دے رہا تھا "ریت آ گئی ہے تمہارے رُکھ تک ۔۔۔ آؤ اندر چلیں ۔ چند رُکھ ابھی ہیں آؤ اُن میں گم ہو جائیں ۔۔۔ اور وہ دونوں بھی یہاں ہیں ۔۔۔ آؤ"

اور مامن ماسا تھا یا کوئی سُوکھی لکڑی کی ٹہنی تھی جو مُسکراتی تھی کہ نہیں اب میں نہیں آؤں گا میں رُکھوں میں رُکھ ہوں اور الگ نہیں ہوں ۔

اُس کا بھاری سیاہ لشکتا جُسّہ ڈورگا کی ہڈیوں کو کُچلتا تھا اور اُس کا سانس بند ہوتا تھا اور اُس کے تھنوں میں سے رَت اُبلتی تھی اور وہ جان رہا تھا کہ اب میں گیا ۔ میں جو آیا تھا تو اب گیا ۔ اور میں ایک بار پھر اُدھڑوں گا اور مات کھاؤں گا ۔۔۔ اُن دونوں کا پسینہ ریت میں گرتا تھا اور اُسے کیچڑ میں بدلتا تھا اور وہ دونوں اِس کیچڑ میں کیچڑ ہوتے تھے اور ایک دھمک تھی جو پھیلتی تھی اور رُکھوں سے باہر جاتی تھی اور جہاں پاروشنی تھی وہاں تک جاتی تھی اور وہ سنتی تھی ۔۔۔ اور پھر وہ دونوں زور لگاتے تھے ۔۔

اور ایسے ایک پہر ہو گیا اور شام اندر آ گئی ۔۔۔ اور پھر اُس نے جانا کہ اُس میں جان نہیں ہے اور وہ گیا اور اُس میں سکت گم ہوئی ۔۔۔ اور ہر طرف چپ تھی ، سنسانی تھی پر مور بولتا تھا ایسے جیسے پہلے بولتا تھا جب رُکھوں میں ہریاول تھی اور روز مینہ اُترتا تھا اور جھیل کے پانی تھے جہاں پکھیرو اُترتے تھے اور جب پاروشنی اُس کے قریب سے گذری تھی تو وہ مَستی میں بولتا تھا ۔

بھینسے کا سیاہ جُسّہ دھیرے دھیرے ٹھنڈا ہو رہا تھا ۔

ڈورگا نے اپنے آپ کو اُس سے الگ کیا اور پرے ہو کر کھڑا ہو گیا ۔۔۔ اور سیدھا کھڑا ہو گیا ۔۔۔ جُھکا ہوا تھا پر اب نہیں تھا ۔

سیاہ جُسّہ ٹھنڈا ہو گیا اور اُس کی آنکھیں ڈورگا کو دیکھتی تھیں اور وہ اسے دیکھتا تھا جس نے اُسے ایک ہزار برس تک موہنجو میں بند رکھا تھا اُسے اور اُس جیسے بے انت بندوں کو ۔۔۔ جن کے پسینے کی مہک اب اُسے آتی تھی ۔

بھینسے کا سیاہ اور زور والا جسم ٹھنڈا ہو گیا ۔۔۔ اور وہ اُس کے سامنے پڑا تھا ۔

پھر پہلی چیونٹی آئی ۔۔۔

اور اُس کے بعد خُشک پتّے اور سُوکھی ٹہنیاں اُن سے سیاہ ہونے لگیں جیسے پتّے چلنے لگے ہوں ۔ جیسے ٹہنیوں میں جان پڑ گئی ہو ، پر وہ ساری چیونٹیاں تھیں اور ادھر آتی تھیں اور ڈور گا نے اُنہیں دیکھا تو ڈرا اور اُس کے ڈر کو سُونگھ کر ایک چیونٹی نے کہا ۔۔۔ "ہم تجھے نہیں اِسے لینے آئی ہیں" ۔۔۔ اور وہ اُس کے سیاہ جُتّے پر چڑھنے لگیں اور اس کے نیچے اور اوپر اور ہر طرف سیاہ ہونے لگیں یہاں تک کہ بھینسے کا مردہ جسم دھیرے دھیرے ویسے ہی چلنے لگا جیسے چیونٹیوں سے بھرا ہوا روٹی کا ایک ٹکڑا چلتا ہے اور وہ اُسے اٹھا کر لے جا رہی تھیں اور ڈور گا حیرت میں کھڑا تھا۔

"ہم اسے لے جائیں گی پر یہ پھر آجائے گا ۔۔۔" ایک چیونٹی نے کہا ۔

"پھر آجائے گا ؟۔۔۔" ڈور گا پھر ڈرا ۔

"ہاں ۔۔۔" دوسری بولی "اور تم پھر اسے مارو گے ۔۔۔ اور ایسا ہوتا رہے گا ۔۔۔"

"ہاں ہمیشہ ۔۔۔" سب چیونٹیوں نے مل کر کہا "۔۔۔ یہ پھر آئے گا ۔۔۔ اس کے بغیر کوئی سمے پورا نہیں ہوتا"

"اور میرے بغیر ؟"

"اور تمہارے بغیر بھی ۔۔۔" سب چیونٹیاں بول رہی تھیں "اور تم پھر اسے مارو گے ۔۔۔ اور ایسا ہوتا رہے گا ۔۔۔" اور وہ اُسے لے گئیں ۔

اور تب ڈور گا نے اپنے آس پاس دیکھا اور دیکھا کہ وہاں اب ایک بھی رُکھ نہیں اور سایہ نہیں اور وہ ریت کے بے اَنت میدان میں اکیلا کھڑا ہے اور وہاں سے بستی کے چھپر اور گھاگھرا کے اونچے کنارے صاف دکھائی دیتے ہیں اور وہاں بھی ریت ہے ۔۔۔ ہاں اُس نے دیکھا کہ اس میدان میں دو ٹہنیاں ہیں ایک دوسرے سے چمٹی ہوئیں اور اُن میں جیسے جان ہے اور اُس نے دیکھا کہ ایک مور ہے جس کے رنگ پھیکے پڑ چکے ہیں اور آنکھیں خشک ہو چکی ہیں پر وہ اپنا جھاڑو پھیلائے کھڑا ہے اور چونچ کھولتا ہے بولنے کو پر بول نہیں سکتا ۔۔۔

دُھروا لگتا نہیں تھا کہ سانس لیتا ہے پر ابھی اُس میں حیاتی کا اُپلا سلگتا تھا اور اُس پر جمی راکھ کی تہہ سے دکھائی پڑتا تھا کہ شائد اندر کچھ نہیں پر وہ سانس لیتا تھا ۔۔۔ وہ اپنے تھڑے پر پڑا تھا اور اُس کی ٹھوڑی سے لٹکا سفید بالوں کا گچھا ہولے ہولے ہِلتا تھا ۔ کبھی کبھار اُس کا پتلا بازو آہستہ سے اُٹھتا اور وہ اس گچھے کو ٹھوڑی سے چپکانے کی کوشش کرتا ۔۔۔ اُس کے قریب ایک جھجھر تھی جو ورچن وہاں رکھ گیا تھا اور اُس میں مٹّی ملا پانی تھا جو وہ پیتا تھا پر اب جھجھر کی تہہ میں نِری مٹّی تھی اور پانی ختم ہو چکا تھا اور وہ پچھلے تین چار روز سے یونہی تھڑے پر پڑا راکھی دے رہا تھا ۔ اُسے ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ اندر باڑے مں کتنے بیل باقی ہیں باقی ہیں بھی کہ نہیں ۔۔۔ اُس نے ہمت کر کے آنکھیں کھولیں تو دُھوپ اُن میں پگھلنے لگی ۔۔۔ وہ اِس دُھوپ کو نہیں جانتا تھا ۔ یہ نِری آگ تھی اور اس میں نِری جلن تھی ۔۔۔ باڑے کی دیوار خالی تھی اور اُس کے ساتھ چارے کا کوئی گٹھا نہ تھا ۔۔۔ چارہ لانے والے اب وہاں نہیں تھے ۔۔۔ اور چارہ بھی نہیں تھا ۔۔۔ اور اُدھر رُکھوں میں بھی تو اب کچھ نہیں تھا نہ گھاس ، نہ ہریالی ، نہ پتّے ۔۔۔ اور اُس نے ادھر دیکھا ۔ اور غور سے دیکھا اور پھر سر جھٹکا ۔۔۔ جتنا جھٹک سکتا تھا کہ وہاں ادھر جہاں رُکھ ہونے چاہیئے تھے وہاں کچھ بھی نہ تھا ۔۔۔ اور ریت یہاں سے وہاں تک جہاں تک نظر جاتی تھی ، لشکتی تھی اور اس میں نِری جلن تھی ۔۔۔ اُس کے دل میں آیا کہ یہ وہی دن ہے یم کے کُتّے آئیں گے تبھی اُسے رُکھ دکھائی نہیں دیتے تھے ۔۔۔ وہ تو وہاں ہوں گے پر اُس کی آنکھوں کے سامنے کچھ اور آگیا تھا ، پر لگتا یہی تھا کہ وہاں اب کچھ نہیں ۔۔۔

بستی سے نکلنے کے لئے راستہ ادھر سے جاتا تھا اور جو نکلتا وہ ادھر سے جاتا اور دُھروا کو کہتا کہ تو بھی چل ۔۔۔ دیکھ ہمارا ٹبر آدھا رہ گیا ہے ، ہمارے مال ڈنگر آدھے رہ گئے ہیں تو ہم نے اِسے چھوڑا ہے ، ہم چھوڑنا نہیں چاہتے تھے پر اگر یہاں رہیں گے تو پھر ہم نہیں رہیں گے تو بھی

چل ۔۔۔ تو دُھروا کہتا کہ نہیں اور بڑی مشکل سے "نہیں" کہتا ۔ کیونکہ اُس میں تو دوسروں سے بھی کم سکت تھی ، میں ادھر راکھی پر بیٹھا ہوں اور ادھر سے جا نہیں سکتا ۔۔۔ راکھا چلا جائے تو بیل کیا کہیں گے ۔۔۔ نہیں میں نہیں جا سکتا ۔۔۔ اور اب کتنے دنوں سے ادھر کوئی نہیں آیا تھا شائد سب جا چکے تھے اور وہاں گھاگھرا کے ساتھ جہاں گھاگھرا بہتا تھا اُس کے ساتھ جو دو چار گلیاں تھیں اُن میں اب ریت تھی اور گھروں کے چھپّر ڈھے چکے تھے یا آندھی سے اڑ چکے تھے اور وہاں کوئی نہ تھا اور وہ اکیلا رہ گیا تھا ۔۔۔ اِس خیال سے اُس کے کلیجے میں ہول اٹھا کہ اس بستی میں اور رُکھوں میں ، جو وہیں ہوں گے جہاں تھے پر اُسے نظر نہیں آ رہے تھے اور گھاگھرا کے آس پاس وہ اکیلا رہ گیا تھا ۔۔۔ اُس کے سُوکھتے جُسّے میں ایک جھرجھری سی آئی اور وہ جانے کیسے کچھ زور لگا کر کہنیوں کے بل اٹھ کر بیٹھ گیا ۔۔۔ باڑے کے اندر وہ تھے جن کی وہ راکھی کرتا تھا تو وہ اکیلا کیسے ہوا ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ وہ گھسٹتا ہوا تھڑے سے اُترا اور پھر دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا ۔۔۔ وہ اندر ہیں باڑے میں تو اُن کے پاس چلتا ہوں ، یہاں اور کوئی نہیں تو کیوں بیٹھا رہوں ۔۔۔ وہ بڑبڑا رہا تھا ۔۔۔ دروازے کے اندر نیم تاریکی تھی اور اُس میں سے جو باس نکلتی تھی وہ پیٹ سے سب کچھ باہر نکالتی تھی پر دُھروا کے پیٹ میں کیا تھا جو باہر آتا ۔۔۔ اندر وہ تھے پر گلتے سڑتے اور بودار پانی چھوڑتے جُسّے تھے جن میں سے اُن کی ہڈیاں باہر نکلتی تھیں اور اُن کے گرد ماس ڈھلکتا تھا اور اُن کی آنکھیں بہہ چکی تھیں ۔

دُھروا نے اُنہیں پاس جا کر تھپکا ۔۔۔ اور اُس کے تھپکنے سے ماس ہڈیوں سے گر کر زمین پر بہنے لگا ۔

پر اُن میں سے ایک کی آنکھیں تھیں اور دیکھتی تھیں ۔۔۔ وہ اٹھ نہیں سکتا تھا اور گرا ہوا تھا پر دیکھ سکتا تھا ۔۔۔

اور اُن میں سے ایک اور تھا جو ابھی تھا اور وہ بھی دُھروا کو دیکھتا تھا ۔۔۔ دُھروا کو بھی اُن دونوں کی چار آنکھیں اندھیرے میں نظر آ گئیں اور وہ جان گیا کہ وہ اُسے ایسے کیوں دیکھتے ہیں ۔۔۔

اُس بودار اور گلتے سڑتے اندھیرے میں کچھ دیر بعد صرف چار آنکھیں تھیں جو اندھیرے میں نظر آتی تھیں اور اگر کوئی اُن میں دیکھتا تو جان جاتا کہ دُھروا اب کہاں ہے ۔

اور آخر کار ورچن نے اُس سویر دیکھا کہ یہ سویر بھی ویسی ہی ہے جیسی بے انت گذر چکی ہیں اور پاروشنی اور اُس کی ہڈیوں کا گودہ خشک کر چکی ہیں اور آج بھی وہی دن تھا جو پہلے تھا اور کوئی فرق نہیں ۔۔۔ ہاں اتنا فرق ہے کہ یہ دن اُس برتن کے پاس ہے جو اُنہیں مٹی میں لے کر جاتا ہے ۔۔۔ اب وہاں گھاگھرا نہیں تھا ۔۔۔ اُس کے اونچے کنارے تھے جن کے اندر کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے جوہڑ تھے اور پکلی کے گھڑے کچھ ٹوٹے ہوئے اور کچھ سالم ادھر ادھر اوندھے سیدھے پڑے تھے ۔۔۔ اور ان میں سے کچھ ریت میں دبتے تھے ۔۔۔ اور وہاں بستی نہیں تھی ، صرف وہ دونوں تھے اور شائد آوے کے پاس ڈور کا ہو ۔۔۔ شائد ہمرو بھی ہو جو پہلے روز آتا تھا اور ویہڑے میں جھانک کر چلا جاتا تھا اور اب کئی روز سے دکھائی نہیں دیا تھا اور اُن کے علاوہ ۔۔۔ وہاں جلانے والی دھوپ اور خشکی اور ہول تھا جو کلیجے میں بل کھاتا تھا اُن وادرولوں کی طرح جو اب گلیوں میں اور اونچے کناروں پر اٹھتے رہتے تھے ۔۔۔ اور پیاس تھی ۔ وہ جان گیا کہ اگر وہ آج نہ اُٹھا تو شائد کل اُس کے گھٹنے جواب دے جائیں اور سارا جسّہ وہیں گر کر ریت ہو جائے ۔۔۔ ویہڑے میں بھی پاروشنی کا پوچا ہوا فرش نہ تھا نری ریت تھی جو چوکھٹ سے اندر گرتی رہتی تھی ۔۔۔ اور اُنہوں نے اُس آدھی مٹھی کنک کی روٹی کے سوا آج تک کچھ نہیں کھایا تھا ۔۔۔ اور اُن کے اندر صرف مٹیالا پانی تھا جو ہر سویر اُنہیں کم زور کرتا ۔۔۔ تو وہ جان گیا کہ کل سویر وہ اٹھ نہیں سکے گا اس چوکھٹ کے پار نہیں جا سکے گا تو وہ اٹھا ۔۔۔ پاروشنی چولہے کے پاس پڑی تھی جیسے سوکھا ہوا پرندہ ہو ۔۔۔ جھیل کنارے گرنے والے پرندے چند دنوں بعد ایسے ہی ہو جاتے تھے جیسی کہ اب پاروشنی تھی ۔۔۔ ہڈیاں اور ڈھیلا ماس ، جبڑا باہر کو نکلا ہوا اور کھوپڑی جیسے تنگی ہونے کو ہو اور ہونٹ ایسے کھنچے ہوئے کہ دانت ڈھک نہ پائیں ۔۔۔

"پاروشنی ۔۔۔" وہ اُس کے قریب ہوا اور نرا بولنے سے اُس کا سانس اُکھڑتا تھا ۔۔۔

اُس کی آنکھیں تھوڑی سے کھلی تھیں جیسے چوری دیکھتی ہوں اور اُن آنکھوں میں زردی تیرتی

تھی ۔۔۔ اُس کے چہرے پر ایک مکھی بھنبھنانے لگی ۔۔۔ ورچن کا دل نیچے ہوتا گیا ۔۔۔ یہ چلی تو نہیں گئی ؟ "پاروشنی ۔۔۔" اُس نے اپنا ہاتھ اُس کے بازو پر رکھا اور تب اُس کے پپوٹے پورے اُٹھے پر وہ وہیں پڑی رہی ۔

"اُٹھو ، اب چلتے ہیں ۔۔۔" اُس نے اُس کے بازو کو پکڑا اور اُسے کاندھے پر رکھ کر سہارا دیا کہ وہ اُٹھ کر بیٹھ سکے پر وہ اٹھ نہ سکی ۔

"اُٹھو ۔۔۔" اُس نے ایک گہرا سانس لے کر زور جمع کر کے کہا "اٹھو ۔۔۔ چلیں"

اُس کی آواز مدھم تھی جتنی مکھی کے بھنبھنانے کی تھی پر سنائی دی "کہاں ؟"

"جہاں پانی ہو ۔۔۔" وہ مُشکل سے بولتا تھا "کہیں بھی ۔۔۔ یہاں سے چلیں"

"ہُوں ۔۔۔" پاروشنی نے اُسے دیکھا ۔

"ہم ڈورگا کو بھی ساتھ لے لیں گے ۔۔۔ موہنجو بھی جا سکتے ہیں ۔ وہاں سندھو ہے ۔۔۔"

دانتوں پر سے ہٹے ہوئے ہونٹ اور ہٹے اور وہ مسکرائی اور پھر ہولے ہولے وہ اپنے آپ اُٹھنے لگی اور گھسٹ کر دیوار کے ساتھ لگ گئی "نہیں ۔۔۔" اُس نے کہا اور اُس کی آواز اور دُور اور کم سُنائی دینے والی تھی ۔۔۔

"نہیں ؟" ورچن حیرت میں ہوا "کچھ مر چکے ہیں اور کچھ جا چکے ہیں ۔۔۔ پانی نہیں ہے اور ریت ہے ۔۔۔ اور کل تک ہم ہمیشہ کے لئے گم ہو جائیں گے اور ہمارا ماس مکوڑوں کے لئے ہو گا ۔۔۔ اُٹھو چلیں ۔۔۔" وہ رُکا اور ایک گہرا سانس لیا ۔۔۔ "میں اب تک تمہاری طرف دیکھتا رہا ہوں کہ تم کیا کہتی ہو ۔۔۔ اور اب میری آنکھیں مدھم ہو رہی ہیں اور میں تمہیں دیکھ نہیں سکتا"

پاروشنی جیسے گہرائی میں ہو اور وہاں سے جیسے گہرے کنویں پانی سے خالی کنویں میں سے اُس کی "نہیں" کا آواز آئی ۔۔۔ "سُنو ۔۔۔" اُس نے اپنا ڈھانچہ ہاتھ ورچن کے سینے پر رکھا "میرے پاس آدھی مُٹھی کنک ہے ۔۔۔"

اور تب ورچن نے جانا کہ پاروشنی جا چکی ہے اور اب یہاں اُس کا پنجر ہے اور دُھوپ نے اور بُھوک پیاس نے اُس کا بھیجہ نرم کر دیا ہے اور وہ پاروشنی جو تھی اور اُن دونوں پر پورا چاند پڑتا تھا اور وہ رُکھوں کے بیچ جھیل کے پاس اُس کلراٹھی زمین پر جو کبھی جھیل تھی لیٹے تھے اور وہ ایسے پڑی تھی جیسے پتّوں اور ٹہنیوں والا ایک رُکھ گرا پڑا ہو تو وہ پاروشنی جا چکی تھی اور یہ سامنے

اُس کا پنجر تھا پر وہ اِس پنجر کو بھی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا ۔

"چلو پاروشنی ۔۔۔ اب ہم ٹھیکریوں سے جانے جائیں گے ۔۔۔ اب کھیت ہرے نہیں ہوں گے ۔۔۔ چلو"

"نہیں ۔۔۔" پاروشنی بولی اور ایسے بولی کہ ورچن نے دوبارہ نہ کہا کہ چلو ۔

وہ اٹھا تو لڑکھڑا گیا ۔ اُس کا جُسّہ اُس کا ساتھ نہ دیتا تھا ۔۔۔ وہ پھر بیٹھ گیا ۔۔۔ میں یہاں کیا کر رہا ہوں ؟ ۔۔۔ یوں ایسے پڑے رہنا کہ ہوا کم ہو جائے اور سانس نہ آئے اور گلے پر ہاتھ رکھ کر بندہ ہونکتا ہوا ٹھنڈا ہو جائے اور اُس پر ریت کی تہہ جمتی جائے اور دُھوپ اُسے خشک کر دے ۔۔۔ مکوڑوں کا اَن پانی بن جائے ۔ وہ اٹھا اور لرزتی ٹانگوں نے اُسے چوکھٹ تک پہنچا دیا ۔ پاروشنی کی آنکھیں اُسی طرح آدھی کھلی تھیں اور اُن میں زردی تیرتی تھی پر اُنہوں نے ورچن کو چوکھٹ پار کرتے دیکھا ۔

باہر خالی گلی میں ریت پر اُس کے پاؤں گھسٹتے تھے اور اُس کا پسینہ گرتا تھا ۔

چار دیواری کے اندر ڈور گا تھا اور اُس نے دیکھ لیا کہ ورچن آیا ہے اور کھڑا ہے اور بول نہیں سکتا اور اُس کا سانس ٹوٹتا ہے ۔

"چلو ۔۔۔" بالآخر ورچن نے کہا اور ڈور گا نے اُسے سہارا دیا اور وہ پکلی کے آوے اور گھاگھرا سے دور ہونے لگے ، لڑکھڑاتے اور کم زور جُثّے جو ریت پر گھسٹتے ، ہاں ورچن نے یہ دیکھا کہ ڈور گا اب جھکا ہوا نہیں ہے ۔

وہ وہیں کئی دن پڑی رہی اور اُس کے مہاندرے پر مکھیاں بھنبھنانے لگیں کیونکہ نہ وہ چلتی تھی اور نہ آنکھیں کھولتی تھی اور وہ جہاں تھی وہیں رہی ۔۔۔ اُس کا ویہڑا ریت سے بھر رہا تھا ۔

دھوپ تیز ہوتی تو وہ تھوڑی سے سُکڑ جاتی اور دیوار کے ساتھ لگ جاتی ۔۔۔ اُس کا منہ کھلا رہتا اور آنکھوں میں زردی تیرتی ۔ وہ اپنے اندر کہیں سانس لیتی تھی پر باہر سے پتہ نہ چلتا تھا اور اپنے اندر کہیں سوچتی تھی کہ میں ابھی ہوں اور اپنے ویہڑے میں پڑی ہوں اور ریت چوکھٹ پر سے اندر گر رہی ہے اور مجھ پر مکھیاں بھنبھناتی ہیں اور ورچن جا چکا ہے ۔۔۔

یہ اسوّں کا اخیر تھا اور گرمی اب بھی ہر شے کو سُکھاتی تھی اور اُس کا پھوک بناتی تھی ۔۔۔ اِنہیں دنوں وہ کھیت کھودتے ، بیج ڈالتے اور بڑے پانی کی اڈیک میں بیٹھتے ۔۔۔ پر اُن دنوں

وہ ایک بستی تھے جیسا کہ اُس پکھیرو نے دیکھا تھا کہ نیچے ایک لکیر ہے اور اُس کی سکڑتی آنکھوں نے پہچان کی تھی ، لشکتی لکیر ریت نہ تھی اُس میں نمی کی جھلک تھی اور اُس لکیر کے کنارے کوئی بستی تھی اور اُس سے پرے ہریاول کے ٹکڑے اور رُکھ تھے جن کی باس مردہ ہوتی ناک میں بھی اترتی چلی گئی تھی ۔۔۔ اور پھر نیچے رُکھوں میں گھری ایک جھیل تھی ۔۔۔ پانی ۔۔۔ اُس نے اپنے پر سمیٹے اور پھڑپھڑاتا ہوا نیچے آنے لگا ۔۔۔ مرنے کے لئے ۔

وہاں پڑی وہ اپنے اندر کہیں سوچتی تھی کہ مجھ پر مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں اور میں اس دھوپ اور جلتی گرمی میں پڑی ہوں اور مجھ میں اتنا زور نہیں کہ اپنا سوکھا ہوا پنجر گھسیٹ کر اندر جاؤں کنویں والے کمرے میں اور بوکے میں سے پانی نکالوں ۔۔۔ پانی ۔۔۔ اُس کی زبان تالو کے ساتھ چپک کر خشک ہو چکی تھی اور اُس کے اندر اتنی نمی نہ تھی کہ اُسے پسینہ آتا ۔۔۔ وہ ایک خشک لکڑی کی طرح دھوپ میں پڑی رہی ۔۔۔

ایک سویر ایسی آئی کہ مکوڑے اُس کے جُثے پر رینگتے تھے اور اُس کے کھُلے مُنہ میں مکھیاں بھنبھناتی تھیں ۔۔۔ اُس کی ادھ کھلی آنکھوں کے سامنے کچھ نہ تھا اور وہ ڈوبتی تھی اور تب اندر ہی اندر اُس نے جانا کہ وہ جانے کو ہے اور اس بستی میں اُس کے سانس پورے ہوئے ۔۔۔ پر وہ ایسے تو نہ جاتی تھی ۔۔۔ نہ ۔۔۔ وہ اپنی بستی چھوڑ کر ایسے نہ جاتی تھی ۔۔۔ اُس کے پپوٹے اوپر ہوئے اور اُس کا ایک ہاتھ بُری طرح کانپنے لگا جسے اُس نے دوسرے ہاتھ سے دبا کر روکا ۔۔۔ اُس نے مُشکل سے اپنا منہ بند کیا جو کب سے کھلا پڑا تھا ۔ پھر اُس نے دونوں ہتھیلیاں ویہڑے کی ریت پر جمائیں اور اُس کا جُثہ کپکپا رہا تھا جیسے سُوکھے پتّے کے نیچے مکوڑے چلتے ہیں تو وہ کپکپاتا ہے ۔۔۔ وہ دھیرے دھیرے کھسکنے لگی ۔۔۔ ابھی اُسے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا پر وہ ایک مردہ ٹانگ کے کُتے کی طرح ہولے ہولے گھسٹتی رہی اور اپنے آپ کو کنویں والے کمرے کے پاس لے گئی ۔۔۔ وہاں ایک نَم ٹھنڈک ہوتی تھی ۔۔۔ پر اب نہیں تھی ، اب وہ ایک تنور کی طرح تپتا تھا ۔۔۔ منڈیر پر رکھے بوکے کو اُس نے ہاتھ سے دھکیلا تو خاموشی رہی اور کچھ دیر بعد وہ کہیں گرا ۔۔۔ پار وشنی ادھر پڑی رہی بہت دیر تک اور کبھی وہ اندھیرے میں ہوتی اور کبھی اُسے کچھ دکھائی دے جاتا ۔۔۔ وہ بہت دیر تک پڑی رہی اور پھر اُس نے رسّی کو تھام کر کھینچنا شروع کر دیا ۔۔۔ اور یہ بوکا کبھی اتنا بھاری نہ تھا ۔۔۔ وہ اُسے تھوڑا کھینچتی اور ہونکنے لگتی اور پھر بہت دیر پڑی رہتی اور پھر کوشش کرتی ۔۔۔ بوکا منڈیر کے پاس آگیا تو اُسے جُھک کر ہاتھ سے باہر لانے کا مسئلہ تھا اور وہ اُس پر جُھکی رہی ۔۔۔ اُس نے بوکے کو پکڑ

رکھا تھا پر اُس میں اتنا زور کہاں تھا کہ اُسے باہر نکالتی اور ایک بار تو بو کا اُسے اپنے ساتھ کنویں میں گھسیٹنے لگا اور وہ منڈیر سے ٹکرا کر ادھر گر گئی ۔ وہ سانس میں بے حال ہوتی رہی اپنے اندر ہوا کھینچنے کا جتن کرتی رہی اور آخر کو اُس نے بو کا باہر نکال لیا ۔ وہ بھاری بہت تھا ۔۔۔ اُس میں پانی نہ تھا نرا کیچڑ تھا ۔ اِس کیچڑ میں اُس نے ہاتھ ڈالے اور پھر اِسے اپنے مہاندرے پر ملا اور اُسے یوں کچھ ٹھنڈک ملی ، کچھ زور ملا ۔۔۔ نہیں یہاں اُس ویہڑے میں بیٹھے بیٹھے مجھے مکوڑے نہیں کھائیں گے ۔۔۔ وہ گھسٹتے ہوئے ویہڑے میں آ گئی ۔۔۔ دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھی رہی اور بہت دیر بیٹھی رہی ، پھر دیوار کو تھام کر ڈولتے ہوئے اپنے آپ کو سیدھا کیا اور اُن ٹانگوں پر کھڑی ہو گئی جو کم زور والے دل کی طرح دھڑکتی تھیں ۔۔۔ اُس نے چوکھٹ کو پار کیا ۔ گلی میں ریت تھی ۔۔۔

پیاس اُس کے بدن میں تڑپتے ہوئے بوٹوں کی طرح منہ کھولتی تھی اور چُبھتی تھی اور وہ گھسٹتی ہوئی آگے ہوتی جاتی تھی ۔ اُس کے سوکھے چمڑے کو گرمی پگھلا کر نرم کرتی تھی اور اُس کی ہڈیوں کو دھوپ جلاتی تھی ۔۔۔ اور وہ آگے ہوتی جاتی تھی ۔۔۔ ہلکی سی ہوا تھی جو ریت کو پلٹتی ہوئی چلتی اور اس کے سوا چپ تھی ۔

وہاں سروٹ بھی خشک ہو چکے تھے ، پانی کے بغیر وہ بڑھتے نہ تھے ۔

کنارے کے قریب پہنچ کر وہ ایک بار گری اور پھر منہ کھولے وہیں پڑی رہی ۔۔۔ اُس کے چہرے پر کیچڑ کا پوچا خشک ہو چکا تھا اور اُسے ایک ایسی ڈراؤنی شکل دیتا تھا جسے دیکھ کر پکھیرو بھی تربک سکتے تھے ۔۔۔ اُس کے منہ میں اور بالوں میں ریت جاتی تھی ۔

سمرو اپنے چھپّر میں اوندھا پڑا تھا اور اُس کی آنکھیں بھی بے جان ہوتی تھیں اور اُس کا اندر ریت ہی ریت تھا جس میں نمی کا کہیں شک بھی نہ تھا ۔۔۔ اُس کے اندر بھی کچھ تھا جو کہتا تھا کہ سمرو تم گئے ۔۔۔ تم یہیں پڑے رہو گے اور مکھیاں تمھارے کُھلے منہ کے اندر بھنبھنائیں گی اور مکوڑے تم پر چلیں گے ۔۔۔ وہ اونگھتا تھا ۔۔۔ اور تب اُسے لگا کہ اُس کے چھپّر کے سامنے کوئی تھا ، اور وہ بہت دیر تک سامنے تھا اور پھر آگے ہو گیا ۔ وہ گردن سیدھی کر کے دیکھنے کی کوشش تو کرتا کہ کون ہے پر گردن ڈھلک جاتی ۔۔۔

گھاگھرا میں پکلی کے گھڑوں کی ٹھیکریاں گرم ہوا سے تپتی تھیں ۔

کبھی پار روشنی ایک ناؤ میں اس کے پار گئی تھی اور اُدھر اُوپر خالی آسمان تھا جو روشنی کم کر رہا تھا ۔ اُس کے آس پاس کچھ نہ تھا بس وہ خود تھی اور مٹّی میں ایسی مہک تھی جو اُس کے سر

ہیں اثر کرتی تھی ۔۔۔ اور جب وہ ہلکی ہوئی تھی تو جیسے دریا میں تیرتی تھی کہ اُس کا سارا جسم آس پاس کی مٹّی پانی تھی ۔۔۔ اُس کے کان سنتے تھے ۔۔۔ پر رونے کی آواز نہ آئی ۔

اُس میں ہمت ہوتی تو وہ آج ناؤ کی بجائے چلتی ہوئی اُس پار جاتی ۔۔۔

سانس بند ہو جائیں تو بستی میں کہتے تھے کہ وہ دریا کے پار چلا گیا اور پاروشنی ریت میں پڑی ہوئی تھی اور اُس میں سکت نہیں تھی پار جانے کی نہیں تو چل کر جاتی ۔۔۔ تو پھر پار کہاں ہے ۔۔۔ اور وہاں کیسے جایا جائے ؟

یہ سب کیا ہے ۔۔۔ کیوں ہے ۔۔۔ کدھر ہے ۔۔۔ وہ اگر ہے تو کہاں ہے اور ہم کیوں ہیں ۔ ہم کیا ہیں؟ ماسا پھر ہنسا کہ تم بستی میں کیوں رہتی ہو ؟ ۔۔۔ وہاں پانی ہے گھاگھرا ہے اس لئے ۔۔۔ اور اگر وہاں پانی نہ ہو گھاگھرا نہ ہو ۔۔۔

"پاروشنی ۔۔۔"

اُس نے مہاندرہ ادھر کر کے نہیں دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی کہ جانے کسی نے نام لیا ہے یا نہیں اور کون ہے ۔۔۔ دُکھوں کے سانس ہیں جو یہ کہتے ہیں ۔۔۔ دوسری بار یہ آواز ذرا پاس سے آئی اور یہ سمرو تھا جو منہ کھولے ہانپتا ہوا آتا تھا اور اُس کا جُثہ بھی کم زوری کی بِنا پر لرزتا تھا اور وہ بار بار زبان ہونٹوں پر پھیرتا تھا اور ہونٹ ایسے تھے جیسے پپڑیاں بھری خُشک زمین ۔۔۔

پاروشنی نے اُسے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور جانا کہ وہ ترازو کے دو باٹ تھے، برابر کے، پر نہیں برابر کے نہیں تھے، اِن میں سے ایک بھاری نکلا اور پلڑا ادھر ہوا ۔

اُس نے ہاتھ اٹھایا آگے کیا اور سمرو کے کانپتے بازو کو پکڑ کر سہارا دیا اور وہ اُس کے پاس اور ریت پر اُس کے ساتھ گرا ۔۔۔ اُن کے چُھونے میں ایک زور تھا جو وہ دونوں نہیں جانتے تھے کہ وہاں تھا اور اب اُن کے جُسّوں میں جان ڈالتا تھا ۔۔۔ گھاگھرا کے کنارے اُس جلاتی دھوپ میں جب سورج سر پر تھا اور الاؤ تھا اور آس پاس چپ تھی اور نہ رُکھ تھے اور نہ بستی تھی اور نہ کوئی جنور تھا اور نہ کوئی اور تھا اور نہ پانی تھا ۔۔۔ اونچے کنارے تھے اور ان میں ایک خشک راستہ تھا جس پر کبھی دریا تھا اور اُس پر اب پاروشنی اور سمرو پڑے تھے ۔۔۔ اور اُن کے نیچے کہیں کسی گھڑے کی ٹھیکریاں تھیں جو اُن کو چبھتی تھیں ۔۔۔ اور اُن میں اُس رات کا زور آیا جب وہ رُکھ تھی اور اُس رُکھ میں ورچن جان نہیں ڈال سکا تھا اور تب وہ ادھر آئی تھی اِسی دریا کے کنارے اور یہاں سمرو تھا اور بھر رات کی چپ تھی ۔ چیتر کی چاندنی پھیکی پڑتی تھی اور وہ دونوں بے سُدھ منہ کھولے تھکن سے ٹوٹتے سوتے تھے ۔۔۔ اور اب سورج الاؤ تھا اور آس پاس چپ تھی اور نہ